محمد جعفر پھلواروی

# صلح نامۂ حدیبیہ

مہاجرین کو مکہ سے آئے ہوئے کوئی چھ سال ہو گئے تھے۔ بعض مہاجرین کے اہل و عیال ہنوز مکے ہی میں تھے۔ اس کے علاوہ اکثر مسلمانوں کے دل میں زیارت بیت اللہ کا شوق بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ گو مہاجرین مکہ سے مستقل ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تھے لیکن وطن کی یاد اتنی جلدی دل سے محو نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنا گھر بار، املاک، کھیتی، دوکان اور اہل کفر قرابت داروں کو چھوڑا تھا اور وطنیت کے بت کو توڑا تھا۔ کعبے سے تو منہ نہیں موڑا تھا۔ بلکہ اس مرکز دین سے دور ہونے کا شدید صدمہ تھا اور وہ اس قبلۂ عبادت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے جس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر رہے تھے اور جس کی زیارت اسلام کا چوتھا رکن ہے۔

اسی دوران میں حضورؐ نے خواب دیکھا کہ صحابہؓ کے ساتھ حضورؐ مناسک حج ادا فرما رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر آئندہ سال ظہور میں آنے والی تھی جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ تاہم زیارت بیت اللہ کا شوق حضورؐ پر اور تمام صحابہ پر اس درجے غالب ہوا کہ سب کے سب سفر مکہ کے لیے رخت سفر باندھ کر تیار ہو گئے اور روانگی عمل میں آ گئی۔

یہ چودہ سو مہاجرین و انصار تھے جو عمرہ ادا کرنے کے شوق میں کشاں کشاں جا رہے تھے۔ یکم ذوالقعدہ ۶ھ کو روانگی ہوئی۔ مدینے سے چھ میل پر ذوالحلیفہ کے مقام پر حضورؐ نے اور تمام رفقاء نے عمرے کا احرام باندھا۔ مدینے کی طرف سے آنے والے حجاج کا میقات یہی ذوالحلیفہ ہے۔ احرام کے معنی ہیں حرام کر لینا۔ چونکہ احرام باندھنے میں قتال، جدال،

یا وہ کوئی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے اس لیے اسے احرام کہتے ہیں۔ احرام ایک بے سلا کپڑا ہوتا ہے جسے جسم پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ علامت ہے احرام کی تاکہ دور سے دیکھ کر سمجھ لیا جائے کہ یہ اپنے اوپر قتال و جدال وغیرہ کو حرام کر چکے ہیں۔ یہاں قربانی کے جانوروں کی گردن میں قلادے بھی ڈال دیے گئے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے کہ ان آنے والوں میں کوئی جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ صرف زیارتِ کعبہ اور ادائے عمرہ کی نیت ہے۔ اس سفر میں دستورِ عرب کے مطابق مسلمانوں کے پاس تلواریں بھی تھیں لیکن وہ سب نیام میں تھیں۔ یہ بھی ایک اعلان تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت صرف زائرین کی ہے۔ مسلمان جا بجا پڑاؤ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس کی خبر اہل مکہ کو ہو گئی۔ انہیں یہ تو یقین تھا کہ اہل اسلام چڑھائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ مسلمان ادائے عمرہ کی نیت سے مکے میں داخل ہوں۔ اس لیے انھوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خالد بن ولید (جو ہنوز اسلام نہ لائے تھے) ایک دستۂ فوج کو لے کر کراع الغمیم روانہ ہو گئے۔ حضورؐ ابھی مقام عسفان میں تھے کہ خالد کے آنے کی خبر ملی۔ خالد کے دستے کو پیس کر رکھ دینا ان چودہ سو مہاجرین و انصار کے لیے دشوار نہ تھا لیکن حضورؐ چونکہ صرف عمرے کا ارادہ رکھتے تھے اور ماہِ حرام (ذی قعدہ) کی حرمت بھی قائم رکھنا چاہتے تھے اس لیے دستۂ خالد کا سامنا کرنا بھی گوارا نہ فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے داہنی طرف کترا کر ایک دوسرا کٹھن راستہ اختیار فرمایا۔ خالد نے دور سے مسلمانوں اور سواریوں کی اڑتی ہوئی گرد دیکھی اور اہل اسلام کی قوت و شوکت کا اندازہ کر لیا۔ فوراً واپس ہوئے اور اہل مکہ کو خبر دی کہ مسلمان عمیم کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یہ مقام مکہ سے نو میل پر ہے۔ حضورؐ کی اونٹنی (قصویٰ نامی) مقام حدیبیہ میں رکی۔ حضورؐ اور تمام صحابہ وہیں اتر پڑے۔ حدیبیہ دراصل ایک کنوئیں کا نام ہے جو مکہ سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کچھ آبادی بھی تھی اور یہ پورا علاقہ حدیبیہ ہی کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں چودہ سو صحابہ کے لیے ایک کنواں کیا کفایت کر سکتا تھا؟ پہلی ہی مرتبہ میں کنواں خالی ہو گیا اور پانی کی قلت محسوس ہوئی۔ حضورؐ

کو معلوم ہوا تو دعا فرمائی جس کے بعد پھر بارش کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔

حدیبیہ میں قافلۂ زائرین کے پہنچنے کی خبر جب بنوخزاعہ کو ملی تو ان کے سردار بُدیل بن ورقاء چند آدمیوں کو لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے لیکن مسلمانوں کے حلیف تھے اس لیے ان کی ہمدردیاں اہل اسلام کے ساتھ تھیں اور مسلمانوں کے یہ رازدار بھی تھے۔ بدیل نے آکر حضورؐ کو خبر دی کہ اہل مکہ نے بڑی تعداد میں جنگجو جوانوں کو جمع کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ ہرگز مسلمانوں کو مکّے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حضورؐ نے بدیل ہی کی معرفت قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ ہم لوگ لڑنے نہیں آئے ہیں۔ صرف عمرہ ادا کرکے واپس چلے جائیں گے۔ متعدد جنگوں نے تمہیں یوں بھی کمزور کر دیا ہے (اس لیے ارادۂ جنگ ترک کر دو اور) ایک مدتِ معینہ کے لیے معاہدۂ صلح کر لو۔ (اگر لڑو گے تو) خدا کی قسم جب تک میرے شانوں پر سر موجود ہے میں بھی اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک اللہ تعالےٰ اپنا فیصلہ نہ فرما دے۔"

بدیل نے مکّہ پہنچ کر جب قریش کو حضورؐ کا یہ پیغام سنانا چاہا تو چند جوشیلے عاقبت نااندیش بول اٹھے کہ "ہمیں محمدؐ کا کوئی پیغام سننے کی ضرورت ہی نہیں"۔ مگر سنجیدہ لوگوں نے سکون سے۔ یہ پیغام سنا اور کہا کہ "یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مسلمان عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن اگر وہ زائرین کی حیثیت سے بھی مکّے میں داخل ہوئے تو سارا عرب ہمیں یہی طعنہ دے گا کہ مسلمان فاتحانہ و غالبانہ مکّہ میں داخل ہو گئے اور ہم یہ طعنہ نہیں سن سکتے۔"

بدیل یہ جواب لے کر واپس ہو گئے اور اہلِ مکّہ نے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے حلیس بن علقمہ کو حدیبیہ بھیجا۔ حلیس نے بھی واپس آکر اسی قسم کی گفتگو کی جو بدیل نے کی تھی۔ مگر قریش کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بنوثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا کہ "اگر تم کہو تو میں خود جاکر محمدؐ سے گفتگو کروں۔ انہوں نے جو باتیں پیش کی ہیں وہ معقول ہیں"۔ قریش نے عروہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا۔ حضورؐ نے عروہ سے بھی وہی باتیں فرمائیں جو بدیل کی وساطت سے

قریش کو کہلوائی تھیں۔ عروہ نے حضورؐ کی باتیں سن کر کہا کہ "اے محمدؐ! اگر تم قریش کو فنا کرو گے تو گویا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی ہی قوم کو برباد کرو گے۔ اور اگر کہیں جنگ نے پانسہ پلٹا تو تمہارے یہ رفقا گرد کی طرح اڑ جائیں گے ـــــ۔ عروہ کا یہ جملہ سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تاؤ آ گیا۔ فرمایا: "او بدبخت! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟" عروہ نے کہا "اے ابوبکر! میری گردن پر تمہارا ایک احسان ہے جس کا بدلہ میں نے ابھی تک نہیں اتارا ہے اس لیے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ورنہ تمہاری سخت کلامی کا مزہ چکھا دیتا۔"

عروہ حضورؐ سے گفتگو کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک تک لے جاتا۔ حضورؐ کے پاس مغیرہ بن شعبہ کھڑے تھے۔ عروہ کی یہ حرکت انہیں سخت ناگوار گزری۔ کڑک کر بولے "عروہ! اگر اب تیرا ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک آیا تو تیرا ہاتھ پھر واپس نہ جائے گا۔" عروہ نے کہا: احسان فراموش! میرے احسان کو بھول گئے؟ (ایک موقعے پر چند مقتولین کا خون بہا مغیرہ کی طرف سے عروہ نے ادا کیا تھا) ـــــ یہ عربی فطرت دورِ جاہلیت میں بھی تھی کہ نہ دوسرے کے احسان کو فراموش کرتے تھے نہ اپنے احسان کو بھلاتے تھے ـــــ عروہ نے ایک ہی موقعے پر دونوں جذبے کا اظہار کر دیا۔

عروہ کی گفتگو ناتمام سی رہی۔ وہ مکّے واپس آ گئے اور قریش سے کہا،

اے اہلِ قریش! میں نے نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے اور قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ لیکن عقیدت و احترام اور پروانگی و ادب کا جو منظر اس وقت دیکھ کر آ رہا ہوں وہ کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محمدؐ جب گفتگو کرتے ہیں تو سارے مجمعے پر سکوت طاری ہو جاتا ہے اور سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص محمدؐ کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیا جاتا سارا مجمع اسے اپنے چہرے اور سینے پر ملنے کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے۔ محمدؐ کا لعاب دہن بھی زمین پر گرنے سے پہلے

عقیدتمند اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں"۔ محمدؐ کے اصحاب میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں۔ اب تم جو مناسب سمجھو وہ کرو۔

عروہ کی گفتگو سے قریش پر سناٹا چھا گیا اور ان کی قوت فیصلہ درہم برہم ہو گئی۔ کوئی فیصلہ کر چکنے سے پہلے ہی حضورؐ نے ایک دوسرے خزاعی خراش بن امیہ کو اپنی سواری کا اونٹ دے کر مکّہ روانہ فرمایا۔ خراش ابھی اپنی بات بھی پوری نہ کر پائے تھے کہ ظالموں نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سردار احابش جلیس بن علقمہ نے انہیں پناہ دیدی اور خراش کی جان بچی۔ مگر ان ظالموں نے ان کے اونٹ کو ہلاک کر دیا۔

اس واقعے کے بعد قریش کے اسی جوشیلے نوجوانوں کا ایک دستہ مسلمانوں سے جنگ چھیڑنے کے لیے کوہِ تنعیم سے اتر کر حدیبیہ کی وادی میں پہنچ گیا۔ لیکن حملے کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے محافظ دستے نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ ان کا یہ اقدام فوجی نقطۂ نگاہ سے قابلِ معافی نہ تھا لیکن کچھ تو قربِ حرم کا احترام تھا اور کچھ ماہ حرام کا پاس، اور سب سے بڑھ کر رحمت کے تقاضے

---

(۱) ممکن ہے اس وقت کچھ ایسے عقیدتمند بھی موجود ہوں جو غسالۂ وضو یا تھوک وغیرہ کو اپنے چہرہ و جسم پر بطور تبرک مل لیتے ہوں۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے گرووں کے ساتھ اسی قسم کی عقیدت کا اظہار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضورؐ جیسا لطافت پسند اسے خوشی سے گوارا کرے۔ ویسے خود میری بھی عقیدت یہی ہے کہ حضورؐ کے غسالۂ قدم کے ایک گھونٹ پر کونین کی دولت لٹا دوں لیکن حضورؐ بھی اسے پسند فرمائیں گے یا نہیں یہ غور طلب ہے۔ کہ حضورؐ کی پسند کو ترجیح دی جائے یا اپنے جذبۂ عقیدت کو۔ ممکن ہے یہ خود عروہ یا بعد کے راویوں کا اضافہ ہو یا بطور محاورہ استعمال ہوا ہو۔ ہماری زبان میں بھی "پاؤں دھو دھو کے پینا" کمال احترام و قدردانی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ آخر حضورؐ ہر روز وضو فرماتے تھے اور تھوک بھی پھینکتے ہوں گے لیکن قریب ترین صحابہ سے اس نوع کے اظہارِ عقیدت کی پابندی نظروں سے نہیں گزری ہے۔ حد تو یہ ہے بعض صحابہ سے حضورؐ کا بول و براز فرو کر لینا بھی مروی ہے۔ ایسی تمام روایتیں ہمارے نزدیک محلِ نظر ہیں۔

تھے اور صلح پسندی کا سچا جذبہ۔ اس لیے رحمۃ للعلمین نے ان سب کو معافی دے کر رہا کر دیا۔ قرآن نے ماہ حرام میں حملہ آوروں کے جواب میں قتال کی اجازت دی ہے ولا تقتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقتلوکم فیہ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتال کے موقعے نہیں تلاش فرماتے تھے بلکہ قتال کو روکنے اور صلح کو قائم کرنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ صحابہ میں قریشی نوجوانوں کی اس جسارت سے یقیناً جوشِ انتقام پیدا ہوا ہو گا لیکن جو رسول آیا ہی ہو انسانی اقدار کے قیام کے لیے وہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جذبۂ انتقام ــــ اگرچہ جائز اور جوابی ہو ــــ بلد حرام اور شہر حرام کے احترام کو مجروح کرے؟ اگر ان حملہ آوروں کو قتل کر دیا جاتا تو یہ اس کے مستحق تھے لیکن اہل مکہ کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ ان مسلمانوں نے زائرین کا روپ دھار لیا ہے لیکن دراصل یہ قتال ہی کی نیت سے آئے ہیں۔ اور بظاہر ہمیں معاہدۂ صلح کا پیغام بھجوا رہے ہیں۔ بہرحال اس موقعے پر حضورؐ نے ان مجرموں کو معافی دے کر دینی و اخلاقی قدروں کی محافظت کا انتہائی بلند مظاہرہ فرمایا۔

## سیدنا عمرؓ کا عذرِ مقبول

حضورؐ نے اتمامِ حجت اور مصالحت کی کوششِ مزید کے لیے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "قریش کے پاس اب تم جا کر بات کرو۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! مجھ سے قریش کو انتہائی بغض و عناد ہے کیونکہ میں نے دینی معاملات میں ان کے ساتھ کبھی مداہنت و نرمی نہیں برتی ہے۔ علاوہ ازیں میری قوم (بنی عدی) کا کوئی ایسا آدمی بھی مکے میں موجود نہیں جو مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میری رائے ہے کہ حضورؐ اس نامہ و پیام کا کام عثمانؓ سے لیں کیونکہ وہ بنو امیہ کے ایک معزز رکن ہیں اور بنو امیہ پر ان کا بڑا اثر ہے۔" حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور سیدنا عثمانؓ کو مکہ بھیج دیا۔

یہاں یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر محض جان کی قربانی پیش کرنا مقصود ہوتا تو نہ حضرت عمرؓ ہی کو انکار ہوتا اور نہ کسی دوسرے صحابی کو۔ یہاں محض جان کی قربانی پیش کرنا یا اپنے آپ کو

خطرے میں ڈالنا مقصود ہی نہ تھا۔ مقصد تو تھا ایک کام کو بہتر طریق پر انجام دینا اور نتیجہ خیز طریقہ اختیار کرنا۔ یہاں عشق و محبت یا بہادری و بزدلی کا کوئی امتحان پیش نظر تھا ہی نہیں۔ یہاں صرف عقل و حکمت اور حسنِ تدبیر سے ایک کام انجام دینا تھا۔ حضرت عمرؓ کی معذرت نہ بربنائے بزدلی تھی نہ بربنائے نافرمانی غزوۂ احزاب کے واقعات سے اس مسئلہ کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔

دوسرا ضروری قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ رسول کی بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا ماننا فرض نہیں ہوتا اور نہ ماننے والا خارج از اسلام نہیں ہو جاتا۔ نکاح ام المومنین زینبؓ بنت جحش کی تفصیلات سے اس نکتے کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

## رسول اللہؐ اور بیت اللہ سیدنا عثمانؓ کی نظر میں

حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سیدنا عثمانؓ بن عفان مکہ تشریف لے گئے اور اپنے ایک قرابت دار ابان بن سعید کے گھر ٹھہرے۔ جب اہل مکہ کو حضورؐ کا پیغام مصالحت پہنچا یا تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "ہم محمدؐ اور اصحاب محمدؐ کو ہرگز مکے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ ہاں اگر تم خود عمرہ ادا کرنا چاہو تو کر لو۔" سیدنا عثمانؓ نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اوراق تاریخ پر ہمیشہ ابھرے ہوئے حروف میں ہیرے کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپ نے فرمایا "یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں تنہا عمرہ و طواف کر لوں اور میرا کعبۂ حقیقت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیت اللہ سے دور حدیبیہ میں بیٹھا رہے۔" اللہ اللہ۔ ظاہر بیں فقیہہ کی نگاہوں میں جناب عثمانؓ طوافِ کعبہ کے ایک بڑے ثواب سے محروم رہے۔ مگر حقیقت بیں نگاہ میں اس ترکِ طواف کا ثواب، ثوابِ طواف سے کہیں زیادہ ہے۔

محمدؐ اور عثمانؓ کے درمیان بہت گہرا روحانی تعلق تھا۔ یہاں حدیبیہ میں بعض لوگ بولے کہ "عثمانؓ بڑے خوش قسمت ہیں۔ وہ کم سے کم عمرہ تو ادا کر ہی لیں گے۔" عثمانؓ کے نبض شناس پیغمبرؐ نے فرمایا "مجھے یقین نہیں کہ عثمانؓ میرے بغیر عمرہ و طواف کر لیں۔" صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ عثمانؓ کو حقیقتِ کعبہ کا کیا علم تھا۔ قوم نے تو اس بیت اللہ کو بیت الاصنام بنا دیا تھا۔ یہ کعبۂ حقیقت ہی تھا جس نے حقیقتِ کعبہ سے دنیا کو روشناس کرایا:

از جمالِ تو کعبہ شد قبلہ　　پیش ازیں ورنہ بود بتخانہ

## قتلِ عثمانؓ کی افواہ اور بیعتِ رضوان

سیدنا عثمانؓ نے اہلِ مکہ کو پیغامِ مصالحت دینے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا تو روک لیے گئے۔ واپسی میں دیر ہو گئی تو افواہ دوڑ گئی کہ عثمان شہید کر دیے گئے۔ حضورؐ نے یہ خبر سنتے ہی فرمایا "اگر ایسا ہے تو خونِ عثمانؓ کا قصاص لینا فرض ہے۔" یہ فرما کر ایک ببول کے درخت کے سائے میں تشریف لے گئے اور آواز دی کہ: بایعوا علی الموت (سر دھڑ کی بازی لگانے پر بیعت کرو)۔ آواز کا سننا تھا کہ تمام صحابہ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ اتنا اہم ہے کہ قرآن پاک نے ان تمام بیعت کرنے والوں کو رضائے الٰہی کی دائمی سند یوں عطا فرمائی کہ:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ اِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝

اللہ ان تمام مسلمانوں سے راضی ہے جنہوں نے اس درخت کے نیچے (اے رسولؐ) تمہاری بیعت کی۔ پھر اس نے ان کے دلوں کی بات (نیت و اخلاص) جان لی اور ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں جلد آنے والی فتح سے سرفراز کیا۔

صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس بیعت (سودے) کو اتنی اہمیت دی کہ:

اِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيهِمْ ۚ

جو لوگ (اے رسولؐ) تم سے سودا کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں (تمہارا کیا) خدا کا ہاتھ تھا۔

## خونِ عثمانؓ کی قدر و قیمت اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں

ذرا غور کیجیے۔ دنیا میں کسی کے خون کا قصاص لینے کے لیے بارگاہِ نبوت سے کبھی یہ

اہتمام ہوا ہے؟ کس کی جان اتنی پیاری تصور کی گئی ہے جس کے قصاص کے لیے بیعت کرنے والوں کے حق میں خدا نے اپنی رضامندی کا غیر فانی پروانہ نازل کیا ہو؟ کس کی شخصیت اتنی اہم ہے جس کی حرمت کی خاطر جان کی بازی لگانے والوں ہی کا نہیں بلکہ اس درخت کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہو جس کے سائے میں جاں بازی کا معاہدہ ہوا تھا؟ کس ہستی کا خون اتنا قیمتی سمجھا گیا ہے کہ اس کا قصاص لینے والوں کی بیعت کو محض بیعتِ رسولؐ ہی نہیں بلکہ عین بیعتِ خدا سے تعبیر کیا گیا ہو؟ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ حضورؐ کو اس کا پورا اندازہ تھا کہ عثمانؓ مکہ میں قتل نہیں کیے گئے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے یہ اہتمام کیوں فرمایا گیا؟ اس کی دو وجہیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے جوش و خروش کی اطلاع اہلِ مکہ کو مل جائے تاکہ اگر وہ جنابِ عثمانؓ کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس سے باز آجائیں۔ نیز وہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ بھی کرلیں اور معاہدۂ صلح میں تامل نہ کریں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جنابِ عثمانؓ پر جو مصیبت آنے والی تھی اس کے بارے میں حضورؐ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نازک وقت میں مسلمان خونِ عثمانؓ کو ایسا ہی قیمتی سمجھ کر محافظت کریں اور ہر فردِ امت ان کا قصاص لینے کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑا ہو جس طرح آج حضورؐ ہر ایک کو کھڑا کر رہے ہیں۔ مگر آہ خونِ عثمانؓ بڑی ہی بے دردی سے بہایا گیا۔ امت نے غفلت سے کام لیا جس کے خمیازے میں امت کو پھر کبھی امن و اتفاق دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آج کون عثمانؓ کے بے دردانہ قتل پر آنسو بہانا ثواب سمجھتا ہے؟ آج کس جگہ ان کی بے گناہی و مظلومی کا ماتم کیا جاتا ہے؟ آج کہاں ان کے قاتلوں اور سازشیوں کو بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے؟ سننے والے اپنے اپنے ایمان کا جائزہ لیں۔

مگر خوب ہوا جو حضرت عثمانؓ کے غم کو کوئی مذہبی حیثیت نہ حاصل ہوئی ورنہ ایک اور الگ فرقہ پیدا ہو جاتا جس کا مذہب صرف ماتم عثمانؓ رہ جاتا اور محض چند ایجاد کردہ رسوم پر نجات کا انحصار قرار پاتا۔

## سیدنا عثمانؓ زندہ تھے

بیعت رضوان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جب تمام صحابہ کی بیعت ہو چکی تو حضورؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ "یہ میرا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور اب میں عثمانؓ کی بھی بیعت لیتا ہوں۔" گویا حضورؐ نے اشاروں میں بتادیا کہ عثمانؓ زندہ ہیں کیونکہ بیعت زندوں ہی کی لی گئی تھی اور لی جاتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے رسولؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا (ید اللہ فوق ایدیھم) اور آج بیعتِ رضوان کے وقت رسولؐ اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ رومیؒ نے شاید ٹھیک ایسے موقعے کے لیے کہا ہے:

چوں قبولِ حق شود آں مرد راست — دستِ او در کارہا دستِ خداست

اس شرف کے واحد مستحق تھے بھی سیدنا عثمانؓ ہی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "جس دن میں نے اسلام قبول کرتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں دیا اس دن سے کبھی میرا ہاتھ میری شرمگاہ سے مس نہیں ہوا۔" غالباً یہی سبب ہے کہ اشاعتِ قرآن کا کام اسی مبارک ہاتھ سے لیا گیا۔ یہ "مصحفِ آسمانی" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں مکمل ہو چکا تھا اور اسی کی نقول کی اشاعت کا کام حضرت عثمانؓ نے کیا۔ جناب عثمانؓ صرف "ناشرِ قرآن" ہیں "جامع قرآن" قطعاً نہیں۔ بہرحال دستِ قدرت نے اشاعتِ قرآن کا کام دستِ عثمانؓ ہی سے لیا کیونکہ عثمانؓ کا ہاتھ رسولؐ کا ہاتھ اور رسولؐ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ دستِ او در کارہا دستِ خدا است۔ حتی کنت یدہ التی یبطش بھا (حدیث قدسی)

## صلحنامے کی کتابت

ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ حضورؐ یہ خوب جانتے تھے کہ عثمانؓ قتل نہیں ہوئے ہیں، اس کے باوجود افواہِ قتل پر بیعتِ سرفروشی لینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہل مکہ کو مسلمانوں کے جوش و خروش کا اندازہ ہو جائے اور وہ معاہدۂ صلح کرنے میں زیادہ تامل نہ کریں۔ فی الواقعہ اس کا یہی نتیجہ ہوا

کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و خروش کا علم ہوا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے اور انھوں نے فوراً ایک زیرک اور معاملہ فہم شخص کو اپنا سفیر بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ تھے سہیل بن عمرو جو اپنی طلاقتِ لسانی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے خطیبِ قریش کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ یہ حضورؐ کے پاس آئے اور دیر تک باہم گفتگو کے بعد صلحنامہ لکھا جانے لگا۔ اس تاریخی صلحنامے کے کاتب سیدنا علی بن ابی طالبؓ تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سہیل بن عمرو بولے کہ "عرب کے دستور کے مطابق بسمک اللّٰھم لکھوائیے۔ حضورؐ نے فرمایا "جو سہیل کہتے ہیں وہی لکھو۔ حضرت علیؓ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے بسمک اللّٰھم لکھ دیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا "لکھو ھذا ما قضیٰ علیہ محمد رسول اللہ یعنی اس صلحنامے پر اللہ کے رسول محمدؐ صاد کرتے ہیں)۔ سہیل بولے "اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو جھگڑا ہی کس بات کا تھا۔ اسے کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھوائیے۔ حضورؐ نے فرمایا" اسے کاٹ کر وہی لکھو جو سہیل کہتے ہیں۔"

سیدنا علیؓ چند سیکنڈ کے لیے عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف الامر فوق الادب اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور دوسری جانب الادب فوق الامر اپنی کشش دکھا رہا تھا:

خال او فتویٰ دہد از کعبہ در بتخانہ شو — زلفِ او دعویٰ کند گر عاقلی دیوانہ شو

آخر جذبۂ اطاعت پر جذبۂ محبت و ادب غالب آگیا۔ دوات قلم کو چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے الگ ہو گئے کہ "رسول اللہ کا لفظ کاٹنے کا کام مجھ سے نہ ہو گا"۔ کون جانتا ہے کہ اس "نافرمانی" پر کتنی فرمانبرداریاں قربان ہیں:

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر ست — ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر ست

یہ بھی مقامِ غور ہے کہ جناب مرتضےٰ نے اسم الٰہی الرحمٰن الرحیم کاٹنے میں ذرا تامل نہ کیا مگر محمدؐ کا لقب و منصب رسول اللہ قلمزد کرتے وقت ظاہری نافرمانی کی بھی پروا

نہ کی۔ سچ ہے:

باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

یہاں دوات بھی ہے، قلم بھی ہے، قرطاس (کاغذ) بھی ہے اور رسولؐ کا حکم بھی ہے مگر جذبۂ عشق و ادب کی وجہ سے ظاہری نافرمانی قابلِ ملامت نہیں بلکہ قابلِ ستائش ہے اسی طرح حضورؐ کے آخری حینِ حیات میں جب کہ نہ دوات موجود تھی، نہ قلم اور نہ قرطاس، اگر دوسرا جاں نثارؓ ظاہری نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے ہدفِ طعن کیوں بنایا جائے خصوصاً جب کہ وہ ایک خدا لگتی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ حسبنا کتاب اللہ (اللہ کی کتاب ہم سب کے لیے کافی ہے) اور اس جواب پر رسولؐ مطمئن ہو کر خاموش ہو جاتا اور زندگی کے بقیہ ایام میں پھر دوات قلم کاغذ لانے کی کوئی فرمائش کسی سے بھی نہیں کرتا؟

ادھر سیدنا علیؓ نے "رسول اللہ" کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا اور ادھر رسول اللہؐ کی نگاہوں سے حجابات اٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "اے علی! ایک دن تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آنے والا ہے۔" چنانچہ جب سیدنا علیؓ اور جناب امیر معاویہؓ کے درمیان صلحنامہ مرتب ہونے لگا تو اس پر یہ لکھا تھا کہ: ھذا ما قضی علیہ امیر المومنین علی بن ابی طالب معاویہؓ نے کہا: اگر ہم آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟ سیدنا علیؓ کی زبان سے بے اختیار نکلا: صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضورؐ نے سچ فرمایا تھا ـــــ دونوں معاملے یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اہل کفر اور اہل اسلام کے درمیان معاہدہ ہو رہا تھا اور یہاں دونوں جانب کلمہ گو مسلمان تھے۔ فرق صرف مرتبوں کا تھا۔

## شرائط صلح

الغرض حضرت علیؓ کے انکار کے بعد حضورؐ نے خود لفظ "رسول اللہ" مٹا کر "بن عبداللہ" لکھ دیا یا لکھوا دیا۔ اس کے بعد معاہدے کی مندرجۂ ذیل دفعات لکھی گئیں:

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس ہو جائیں۔ اپنے ساتھ صرف تلواریں لائیں جو نیام میں ہوں اور نیام تھیلے میں ہوں۔ اس دوران میں قریش باہر چلے جائیں گے۔

(۳) جو مسلمان اس وقت مکے میں ہیں انہیں مسلمان اپنے ساتھ واپس نہ لے جائیں بلکہ جو مسلمان اس وقت مدینے سے آئے ہیں ان میں سے بھی جو مکے میں رہنا چاہے اسے رہنے دیا جائے۔

(۴) مکے سے جو مسلمان یا غیر مسلم مدینے چلا جائے اسے واپس کر دیا جائے گا لیکن مدینے سے جو مسلمان مکے آئے اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

(۵) مسلمان اور قریش جس قبیلے کو چاہیں اپنا حلیف یا معاہد بنا سکتے ہیں۔

(۶) فریقین امن و امان کے ساتھ رہیں گے اور دس سال تک یہ معاہدہ قائم رہے گا۔

## اقدار معاہدہ کی عجیب محافظت

اس معاہدے میں اور تو جو کچھ تھا وہ تھا، دفعہ ۲ اور ۴ اس درجے حوصلہ شکن تھیں کہ مسلمان تڑپ اٹھے۔ ہر شخص اسے اسلامی اور قومی وقار کے سخت خلاف سمجھ رہا تھا۔ اس زخم پر نمک یوں پڑا کہ عین اسی معاہدے کے وقت مکے سے ایک مسلمان بھاگتا، ہانپتا کانپتا اور فریاد کرتا ہوا حضورؐ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے جسم پر زخموں کے داغ دکھائے۔ زنجیروں میں جکڑے جانے اور ماریں کھانے کی دردناک داستان سنائی۔ مسلمان اس کی فریاد سن کر لرز اٹھے۔ اس وقت مسلمانوں کا جوش و ولولہ ایسا تھا کہ ایک اشارے میں مکہ خاک سیاہ ہو سکتا تھا لیکن اقدار انسانیت، امن پسندی، صلح جوئی، تحمل و بردباری اور ایثار و قربانی کا جو مظاہرہ آج حضورؐ کی طرف سے ہوا ہے اس کی نظیر تاریخ میں تلاش کرنا سب سے زیادہ ناکام کوشش ہو گی۔

یہ بھاگ کر آنے والا مظلوم کون ہے؟ یہ ہیں حضرت ابو جندلؓ۔ خدا کی شان دیکھیے سہیل بن عمرو ان کے باپ ہیں جو کفار قریش کے نمائندے بن کر آئے ہوئے ہیں اور شرائط صلح لکھوا رہے ہیں۔ اور ابو جندلؓ ان کے فرزند ہیں جو پکے مومن ہیں۔ کوئی خوف اور کوئی لالچ ان کے ضمیر کو نہ خرید سکا۔ قید و بند میں رہے۔ زنجیروں میں جکڑے گئے، صبح شام ماریں کھاتے

رہے لیکن کوئی شے انہیں ایمان سے ہٹا نہ سکی۔ آج یہ مسلمانوں سے فریاد کرتے ہوئے بھاگ کر آئے ہیں اور امداد کے طالب ہیں۔ حضورؐ نے سہیل سے فرمایا کہ "ابوجندلؓ کو ہمارے ساتھ جانے دو۔" سہیل بولے کہ "پابندئ عہد کے مظاہرے کا یہی پہلا موقع ہے۔" حضورؐ نے فرمایا: "ابھی نہ معاہدہ مکمل ہوا ہے نہ دستخط ہوئے ہیں۔" سہیل نے کہا "اگر ابوجندلؓ واپس کیا گیا تو ہمیں یہ معاہدہ ہی منظور نہیں۔"

ابوجندلؓ کو رد کرنے کے لیے اور بھی کئی حجتیں کی جا سکتی تھیں مگر معاہدے کا احترام تمام جذبات پر مقدم تھا۔ ابوجندلؓ سے بصد حسرت فرمایا کہ "تم واپس چلے جاؤ۔ خدا تمہارے لیے کوئی بہتر سبیل نکال دے گا۔"

واہ رے ابوجندلؓ کا جذبۂ اطاعت و ایثارِ نفس۔ وہ صریحاً دیکھ رہے تھے کہ بھاگ کر آنے کے بعد پھر واپس جانا پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن موت کے منہ میں جانا ہے مگر اطاعتِ رسولؐ کے جذبے نے ساری متوقع تکالیف جھیلنے پر آمادہ کر دیا۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ حضورؐ کے اس فرمان پر بھی ابوجندلؓ کا ایمان پختہ تھا کہ "اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبیل پیدا فرما دے گا۔" اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

## حضرت ابوجندل کا حیرت انگیز کارنامہ

حضرت ابوجندل جانے کو واپس چلے گئے مگر مسلمانوں کو بے تاب کر گئے اور خود مکّے میں قید کر دیے گئے۔ اور ایک شخص ان پر نگراں مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ کہیں بھاگنے نہ پائیں۔ جناب ابوجندل کو موقع غنیمت ملا۔ انھوں نے اپنے نگران کے سامنے اسلام پیش کیا اور کچھ ایسے ڈھنگ سے تبلیغ کی کہ وہ بصد خوشی اسلام لے آیا۔ قریش کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس نگران کو بھی قید میں ڈال دیا اور ان دونوں پر ایک اور آدمی کو نگراں مقرر کر دیا۔ اب ان دونوں نے مل کر تبلیغ شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اسلام لے آیا۔ الغرض ایک سال کے اندر حضرت ابوجندل اور ان کے ساتھیوں نے تین سو کافروں کو مسلمان کر لیا۔

## سیدنا عمرؓ کا جوشِ دینی اور تیز گفتگو

سیدنا ابوجندلؓ کے واپس جانے سے سارے مسلمان تڑپ اٹھے۔ جناب عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ بے تاب ہو کر حضورؐ کے پاس آئے اور یوں مکالمہ ہوا:

"یا رسول اللہؐ! کیا حضورؐ پیغمبر برحق نہیں؟"

"ہاں۔ ہوں۔"

"یا رسول اللہؐ! کیا ہم مسلمان حق پر نہیں؟"

"بے شک حق پر ہیں۔"

"تو پھر ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟"

"اللہ ہمارا مددگار ہے۔ وہ ہمیں ہرگز رسوا نہ کرے گا۔"

حضرت عمرؓ کے پاس اس کے بعد خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن جوش اتنا زیادہ تھا کہ وہ وہاں سے سیدھے سیدنا ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور وہاں بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ رازدارِ نبوت صدیق اکبرؓ نے اس کا مختصر جواب یوں دیا کہ "محمدؐ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی مرضی سے کر رہے ہیں۔" اس جواب نے حضرت عمرؓ کا سارا جلال ٹھنڈا کر دیا۔ آپؓ کو اس وقتی دینی جوش اور اپنی تیز گفتگو پر اتنی ندامت رہی کہ ساری عمر مختلف کارِ خیر سے اس کی تلافی فرماتے رہے۔ نفل نماز اور روزے، صدقات، قیدیوں کی رہائی اور دوسرے کارِ خیر سے اس لغزش کا کفارہ ادا کرتے رہے۔

## ام المومنین ام سلمہؓ کی اصابت رائے

معاہدہ مکمل ہونے کے بعد حضورؐ نے ان تمام لوگوں کو جو قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے قربانی ادا کرنے کا حکم دیا۔ کئی بار حضورؐ نے آوازیں دیں لیکن ایک مسلمان بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بظاہر یہ بھی "نافرمانی" ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ طلاقِ زینبؓ کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے ہر ایک حکم کی عدم تعمیل نافرمانی کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اور نہ اسے نعوذ باللہ کفر قرار دیا جا سکتا ہے صحابہؓ

کرام سے زیادہ حضورؐ کی فرمانبرداری کا کون دعویٰ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کے بار بار فرمانے پر بھی کسی کا قربانی کے لیے نہ اٹھنا نعوذ باللہ کسی نافرمانی کے جذبے سے نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سب رسولؐ کے نافرمان ہوں اور خدا ان سب سے راضی ہونے کی آسمانی سند نازل فرمائے؟ سیرت نگار حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان اس حوصلہ شکن معاہدے سے اتنے دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ قربانی کے لیے اٹھنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی وجہ ہو۔ لیکن اور سبب بھی اس کا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابہؓ کو ہنوز یہ امید تھی کہ شاید اب بھی حالات میں کوئی ایسا تغیر پیدا ہو جائے اور کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یہ قربانیاں اپنے اصلی موقع و محل پر ادا ہوں۔ دستور کے مطابق عمرہ ادا کرنے کے بعد ہی قربانیاں ادا ہونی چاہئیں۔ اور بغیر عمرہ ادا کیے قربانی کا ہونا صحابہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تین سو میل سے ادائے عمرہ کی بے تاب تمنائیں لے کر آئے تھے اس لیے ان کی توقع فطری تھی۔ وہ اسے حضورؐ کی ایک اجتہادی رائے سمجھ رہے تھے جس میں "لا و نعم" کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگر وہ اسے وحی الٰہی یا امرِ امیر یا قضائے قاضی سمجھتے تو عدمِ تعمیل کی مجال نہ ہوتی۔

بہرکیف حضورؐ نے جب پوری قوم کی یہ دل گرفتگی دیکھی تو ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جو اس سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ واقعات سن کر ام المومنینؓ نے عرض کیا کہ، یا رسول اللہ! حضورؐ خود باہر نکل کر اپنی رسم قربانی ادا فرمالیں اور سر کے بال اتروا کر احرام اتار ڈالیں۔" ام المومنین کا یہ مشورہ صحیح اور صائب نکلا اور تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ جب حضورؐ نے قربانی ادا کر کے بال اتروائے اور احرام اتار لیا تو تمام صحابہ کو یقین آ گیا اب معاہدے میں کوئی تغیر نہیں ہو گا اور معاہدے کے مطابق عمرہ ادا کیے بغیر ہی یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔ چنانچہ حضورؐ کا عمل دیکھ کر ان سب نے اپنی اپنی قربانیاں ادا کر کے بال اتروا لیے اور احرام اتار دیے۔

## صلح حدیبیہ اور فتح مبین

معاہدے کے بعد تین دن حدیبیہ میں قیام رہا پھر مدینے کو روانگی ہوئی۔ راستے میں یہ آیات

نازل ہوئیں:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ اے رسولؐ! ہم نے تمہارے لیے واضح فتح کے دروازے کھول دیے۔ ........ الخ

وحی الٰہی کی گہرائیوں تک پوری طرح کون پہنچ سکتا ہے؟ مسلمان اس معاہدے کو اپنی قومی شکست اور دینی رسوائی سمجھ رہے تھے اور وحی آسمانی اسے فتح مبین بتا رہی ہے۔ سیدنا عمرؓ یہ آیات سن کر حیرت میں آ گئے۔ ان سے رہا نہ گیا حضورؐ سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! کیا یہ فتح مبین ہے؟" ارشاد ہوا: ہاں۔ حضرت عمرؓ کی سمجھ میں بات نہ آ سکی اور شاید کوئی بھی نہ سمجھ سکا ہوگا۔ ہاں صرف ایک ہی رفیق نظر آتا ہے جو اس پوری داستان تگ و دو میں خاموش، مطمئن اور شروع سے آخر تک رسول کا ہم نوا، ہم آہنگ اور ہم خیال ہے۔ وہ محض اپنے کمال ایمان و عشق کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مومنانہ فراست و حکمت کی وجہ سے ان تمام نزاکتوں، مصلحتوں اور گہرائیوں کو سمجھ رہا ہے جو رسولؐ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ ہے رازدارِ نبوّت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اس معاہدے کے فتح مبین ہونے کی تصدیق بعد کے واقعات نے کر دی۔ اس کے مصالح و فوائد مختصراً یوں ہیں:

(۱) مکے اور مدینے کا راستہ ہر راہی مسافر کے لیے بے خطر کھل گیا اور کاروباری لین دین کی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔

(۲) مکہ و مدینہ کے علاوہ بھی آس پاس اور دور دراز کے قبائل کی آمد و رفت نے مسلمانوں سے روابط پیدا کر دیے۔ وہ دور دور اور کشیدہ رہنے کی وجہ سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہو گئیں۔ انہوں نے براہِ راست اہل اسلام کی ستھری زندگی دیکھی، ایمان و عبادات کو پرکھا، اخلاق و معاملات کو جانچا اور ان کی معاشرتی زندگی کا معائنہ کیا۔ اخوت، مساوات، ہمدردی، اخلاص، عدل، صداقت اور تمام اخلاقی اقدار کا تجربہ

کیا۔ اس طرح ہر ملنے والے کے دل میں اسلام گھر کرتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر اندر اتنی کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ اس سے پہلے برسوں میں بھی اتنے لوگ ایمان نہ لائے تھے۔ فاتح شام و عراق خالد بن ولیدؓ، فاتح مصر عمرو بن العاصؓ اور عدی بن حاتم طائی وغیرہ سب انہی ایام میں اسلام لائے۔

(۳) اب تک اہل اسلام کو عربوں کے اندرونی فتنوں سے ہی فرصت نہ ملی تھی مگر اب عام طور پر عرب میں امن و امان قائم ہو گیا اور حضورؐ کو باہر کے فرمانرواؤں کو بھی دعوتِ اسلام دینے کا موقع ملا۔

(۴) ایک بڑا فائدہ جو اس معاہدے سے ہوا اس کی طرف سیرت نگاروں کی نظر نہیں گئی۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اصل خطرہ ہر وقت اہل مکہ سے تھا کیونکہ مکہ عرب کا مرکز تھا اور اہل مکہ کا اثر و اقتدار سارے عرب پر تھا۔ اب ان سے NON-AGRESSION PACT (ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ) صلح حدیبیہ کی شکل میں ہو چکا تھا اور اہل مکہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب بھی ہو چکے تھے۔ گویا ان کے حملوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اب یہود خیبر تنہا رہ گئے تھے اور ان کی سرکوبی کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ یہ خطرہ نہ تھا کہ اہل مکہ ان یہود کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ چنانچہ جلد ہی مسلمانوں کے شدید دشمن یہود خیبر جیسی فتنہ پرور قوم کا زور توڑ دیا گیا اور فتح خیبر فتح مبین کی تفسیر مبین بن کر سامنے آ گئی۔ حضورؐ یا صدیق اکبرؓ کے سوا کون اس سیاسی گہرائی کو سمجھ سکتا تھا کہ دو بڑے دشمنوں میں سے ایک سے مصالحت کر کے دوسرے کا خاتمہ کر دیا جائے؟

(۵) اس معاہدے سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس معاہدے کی بعض شرطیں خود قریش کے لیے وبالِ جان بن گئیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل مکہ مکے کے مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سے گھبرا کر ایک مسلمان حضرت عتبہ بن اُسید (ان کی کنیت ابوبصیر ہے) مکے سے نکل بھاگے اور سیدھے مدینے پہنچے۔ اہل مکہ نے دو آدمیوں کو مدینے بھیجا اور مطالبہ کیا

کہ اس بھاگے ہوئے آدمی کو شرائط معاہدہ کے مطابق واپس کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جس طرح ابوجندل کو حدیبیہ سے واپس فرما دیا تھا اُسی طرح جناب عتبہ کو بھی واپس ہونے کا حکم دیا۔ عتبہ بہت گڑگڑائے اور اپنی مظلومیت کی داستان بیان کر کے واپس جانے سے معذوری ظاہر کی۔ مگر حضورؐ کو اقدار معاہدہ کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ صاف فرما دیا "معاہدے کی پابندی ضروری ہے اور میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ تم واپس جاؤ۔ اللہ تمہارے لیے کوئی بہتر سبیل پیدا فرما دے گا۔" کتنے بڑے جگرے کا کام تھا ان سخت آزمائشوں میں پھر واپس ہونا۔ مگر عہد کی پابندی اور اطاعتِ رسول کا جذبہ انہیں واپس لے گیا۔ عتبہؓ ان دونوں کافروں کی حراست میں مدینے سے روانہ ہو گئے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر عتبہ نے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا بھاگا ہوا مدینے پہنچا۔ پیچھے سے عتبہ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! حضورؐ نے معاہدے کے مطابق اپنی طرف سے مجھے واپس فرمایا۔ اس لیے حضورؐ تو بری الذمہ ہو گئے۔" عتبہ کو یہ معلوم تھا کہ حضورؐ انہیں مدینے میں نہیں رہنے دیں گے اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مکّے واپس جانا موت کے دہانے میں جانا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مدینہ تو چھوڑ دیا لیکن مکّے بھی واپس نہ گئے۔ بلکہ سمندر کے کنارے ذومرہ کے پاس عیص نامی ایک جگہ میں مقیم ہو گئے۔ مکّے کے مظلوم مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ عتبہ نے اپنا ایک ٹھکانا بنا لیا ہے تو وہ بھی بھاگ بھاگ کر ان کے پاس آنا شروع ہو گئے اور تھوڑے دنوں میں ایک اچھی خاصی جماعت ہو گئی۔ قریش کے تجارتی قافلے عموماً ادھر ہی سے گزر کر مکّے سے شام کی طرف آتے جاتے تھے۔ یہ لوگ ان قافلوں کو روک لیتے اور اسی مالِ غنیمت سے اپنی گزر اوقات کرتے۔ اس سے اہل مکہ کی تجارت و معاش پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ قریش نے حضورؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ "ہم اس شرط سے باز آئے۔ آپ سارے مسلمانوں کو مدینے میں بلا لیجیے۔ ہماری طرف سے سب مسلمانوں کو مدینے جانے کی اجازت ہے۔"

آپ نے دیکھا؟ ——— وہی شرطِ معاہدہ جسے قریش اپنی سب سے بڑی فتح سمجھ رہے تھے ان کے لیے سب سے زیادہ وبالِ جان بن گئی:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں  لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب عتبہؓ اور ان کے رفقا نے اخلاقی قدروں کا کچھ اچھا مظاہرہ نہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کو صرف اسلام لانے کے جرم میں مکّے میں قید رکھنا کونسا مظاہرۂ اخلاق تھا۔ ان سے معاملات، اخلاق اور سوشل زندگی کی کوئی ادنیٰ شکایت بھی نہ تھی۔ پھر انہیں کس جرم میں سخت سے سخت سزائیں دی جا رہی تھیں؟ حضورؐ نے شرائطِ معاہدہ کی پوری پوری پابندی فرمائی اور کسی مسلمان کو جو مکّے سے بھاگ کر آئے اپنے پاس نہ رکھا۔ اب یہ ان مکّی مسلمانوں کا کام تھا کہ انھوں نے مظالم سے عاجز آ کر اپنے بچاؤ کے لیے ایک بنا راستہ نکال لیا۔

(۶) حدیبیہ کے معاہدۂ صلح میں جو سب سے بڑا انسانی فائدہ ہے وہ اخلاقی فتح کا ہے۔ ذرا دیکھیے کتنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت کی گئی ہے۔ یہ چودہ سو مہاجرین و انصار ایسے جانباز تھے کہ ان کے تین سو تیرہ نے بدر کے معرکے میں ایک ہزار مکّیوں کے منہ پھیر دیے۔ ایک اشارے میں یہ چودہ سو جانباز سارے مکّے کو تہس نہس کر سکتے تھے۔ ان کی ایک یورش سارے ظالموں کو خاک میں ملا سکتی تھی۔ اور اس کے لیے کافی وجوہ بھی موجود تھیں۔ صرف ابوجندلؓ ہی کے معاملے پر اڑ جانا معاہدے کو نامکمل چھوڑ کر حملے کا بہانہ بن سکتا تھا۔ لیکن والصلح خیر کی اعلیٰ قدریں حضورؐ کے پیشِ نظر تھیں۔ چودہ سو صحابہ اس معاہدے سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ حضورؐ کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ ہماری قوم اس معاہدے پر راضی نہیں۔ مگر صلح کی جا رہی ہے۔ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔ رفقا کی خفگیوں کی پروا نہیں کی جاتی۔ خون کا ایک قطرہ نہیں بہایا جاتا۔ کیا اقدارِ صلح و امن کی محافظت کا اس سے بہتر نمونہ بھی دنیا کے لیے ہو سکتا ہے؟